منصور احمد لکھنوی

ناصرۃ القلم شاکرہ خاتون

اپنے وفات یافتہ عزیزوں کا ذکر کرنا اور ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں کو یاد کرنا اگرچہ بڑا ذاتی سا عمل ہے مگر میرا خیال ہے کہ اگر وہ وفات یافتہ عزیز اخلاقِ حسنہ نیکی اور خوش اخلاقی میں منفرد ہوں، قربانیاں دینے والے ہوں اور اور قومی اور جماعتی طور پر خدمت کرنے والوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہوں تو ان کا تذکرہ کرنے سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچ سکتا ہے اور ان کی روشن مثال سامنے رکھ کر نیکی اخلاق اور قومی خدمت کے میدانوں میں قدم آگے بڑھائے جا سکتے ہیں۔ اس لئے حکم ہے کہ اذکرو اموتاکم بالخیر۔ یعنی مرنے والوں کا ذکر خیر کے ساتھ کیا کرو تا کہ سننے والوں میں مسابقت کی روح قائم رہے اور قومی اور جماعتی لحاظ سے اچھے کام کرنے والوں کا خلا پیدا نہ ہو سکے۔

یہاں میں جس ہستی کا ذکر خیر کرنا چاہتا ہوں وہ میری ماموں زاد بہن محترمہ شاکرہ خاتون ہیں جن کا انتقال 17 اگست 1995ء کو کینیڈا میں ہوا تھا۔ باجی شاکرہ کے انتقال کو سولہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے مگر وہ آج بھی میرے خیالوں میں زندہ و تابندہ موجود ہیں۔ مگر شاکرہ باجی کا تذکرہ اس وقت تک شروع نہیں ہو سکتا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ ہمارے خاندان میں احمدیت کا نور کس طرح داخل ہوا جس نے ہمارے روز و شب بدل ڈالے اور ایک نئے اور روشن دور کا آغاز کر دیا۔

جب میں اپنی خاندانی روایات پر نظر ڈالتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے خاندان کو احمدیت کے فیض سے روشناس کرانے والے میرے ماموں جان ڈاکٹر لعل محمد صاحب اور میرے ابا جان ڈاکٹر وارث علی صاحب ہیں۔ ماموں جان ڈاکٹر لعل محمد صاحب ڈاکٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد برٹش آرمی میں ڈاکٹر ہو گئے۔ 1909ء میں ان کی پوسٹنگ آسام کے صدر مقام شیلانگ میں ہوئی جہاں خوش قسمتی سے ان کی ملاقات مشہور بزرگ عزیز الواصلین حضرت مولانا غلام امام آسامی سے ہوئی۔ مولانا دراصل بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے شہر شاہجہانپور کے رہنے والے تھے مگر عرصۂ دراز سے آسام میں رہنے کی وجہ سے آسامی کہلاتے تھے۔ حضرت مولانا حضرت اقدس مسیح موعود کے قدیم رفیق تھے۔ ان کی حسنِ رفاقت نے ماموں جان کے دل میں بھی احمدیت کا نور روشن کر دیا اور وہ حضرت اقدس خلیفۃ اول مولانا نورالدین کے ہاتھ پر بیعت کر کے حلقہ بگوشِ احمدیت ہو گئے۔ قبولِ احمدیت کے چند روز بعد ہی ماموں جان کی پلٹن افریقہ بھیج دی گئی جہاں انہوں نے کینیا، اریٹیریا، سومالی لینڈ اور ماریشش میں احمدیت کا نور پھیلانے میں کافی قابلِ قدر کام کیا جس کا تذکرہ مورخِ احمدیت حضرت مولانا دوست محمد شاہدؒ نے تاریخ احمدیت جلد نمبر 4 میں بڑی محبت سے کیا ہے۔ اب رہ گئے ہمارے ابا جان ڈاکٹر وارث علی صاحب تو وہ بھی 1911ء میں برٹش فوج میں بھرتی ہو گئے اور ان کی پوسٹنگ کمپاونڈر کی حیثیت سے فوج کے میڈیکل سیکشن میں ہوئی۔ مختلف مقامات پر قیام کے بعد 1912ء میں ان کی پوسٹنگ انبالہ میں ہوئی جہاں وہ زندگی میں پہلی بار احمدیت کے پیغام سے آشنا ہوئے۔ اس پیغام کا ابا جان پر کیا ردِ عمل ہوا۔ یہ ایک طویل اور دلچسپ داستان ہے جو انشاء اللہ پھر کبھی سناؤں گا۔ بہر حال ابا جان مستقل تحقیق اور غور و فکر کرتے رہے یہاں تک کہ انہیں انشراحِ صدر حاصل ہو گیا۔ اور 14 اپریل 1914 کو وہ حضرت مصلح موعود کے دستِ مبارک پر بیعت کر کے احمدیت میں داخل ہو گئے۔ اس کے چند ہی دن کے بعد ان کا ٹرانسفر کوہاٹ چھاؤنی میں ہو گیا۔ اس دوران یورپ میں پہلی جنگِ عظیم کا آغاز ہو گیا جس میں ابا جان کی یونٹ کو بھی جانا پڑا۔ عراق فلسطین، مصر اور فرانس کے محاذوں پر ان کی یونٹ نے قابلِ ذکر کارنامے انجام دیئے۔ فرانس میں ہی 1916 میں ابا جان ایک بم پھٹنے سے شدید زخمی ہو گئے [illegible] ذرا سنبھلی تو ایک سال کی رخصت لے کر اپنے گھر سیجہ آ گئے۔

کچھ عجب حسنِ اتفاق تھا کہ ابا جان کے سیجہ پہنچنے کے بعد ماموں جان بھی طویل رخصت لے کر سیجہ آ گئے۔ کئی طویل برسوں کی جدائی کے بعد یہ ملاقات بڑی خوش کن اور تسکین بخش تھی مگر اس ملاقات میں ایک شدید اضطراب بھی پوشیدہ تھا۔ سیجہ میں نہ تو کسی کو ماموں جان کی قبولِ احمدیت کے بارے میں کوئی علم تھا نہ ہی ابا جان کے احمدی ہونے کے بارے میں کئی دن اسی پریشانی میں گزر گئے کہ اس انقلاب کے بارے میں کس طرح بتایا جائے مگر کوئی مناسب صورت نہ نکلی۔ آخر ابا جان نے ایک صورت نکالی۔ ان کی بستی کے باہر ایک خاندانی باغ تھا جس میں پھولوں کے پودوں کے علاوہ آم اور امرود کے درخت بھی تھے اور اسی باغ کے ایک گوشے میں بزرگوں کی قبریں بھی تھیں۔ بہت سوچ سمجھ کر ابا جان نے ماموں جان کو اس باغ میں ایک دن گزارنے اور بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کی دعوت دی۔ ماموں جان فوراً تیار ہو گئے۔ طویل راستہ کچھ خاموشی اور کچھ باتوں میں کٹا۔ مگر باغ میں پہنچ کر جب ذرا تنہائی اور یکسوئی نصیب ہوئی تو دونوں بھائیوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دعوتِ حق دینے کی کوشش شروع کر دی۔ جذبات کی شدت کا یہ عالم تھا کہ کوئی کسی کی نہیں سن رہا تھا۔ بس اپنی کہے چلا جا رہا تھا۔ کافی دیر تک تو سمجھ

دہن میں نہیں آیا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ کافی دیر کے بعد احساس ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کو ایک ہی امرِ حق کی دعوت دے رہے ہیں۔ پھر تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا۔ جوشِ مسرت سے ایک دوسرے کے گلے لگ گئے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے فضل پر شکر ادا کرنے لگے کہ اس نے ایک ہی چشمۂ فیض سے دونوں کو اپنی پیاس بجھانے کو موقع عطا کیا۔ دن اسی ذکر اذکار میں اور ایک دوسرے کو اپنے قبولِ حق کی داستان سنانے میں گزر گیا اور شام کو جب دونوں گھر واپس لوٹے تو ایک عجب والہانہ عزم اور جذبے سے سرشار تھے۔

گھر پہنچ کر دونوں نے اپنی مہم کا آغاز اپنے رشتہ داروں سے کیا مگر اس کا نتیجہ وہی نکلا جو ہمیشہ ہی نکلتا رہا ہے۔ چھ انتہائی ہنگامہ خیز اور خطرناک سال سیتھ میں گزرنے کے بعد جب نوبت اقدامِ قتل تک جا پہنچی تو ابا جان اور ماموں جان کو اپنا وطن مجبوراً چھوڑ کر وہاں سے نکلنا پڑا۔ اگرچہ یہ نہایت خطرناک عرصہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اسے بے ثمر نہیں رہنے دیا اور ابا جان کی کاوشوں سے کئی حضرات کو قبولِ حق کی توفیق ملی۔ یہ سارا بیان اگرچہ غیر متعلق ہے مگر اس پس منظر کا گہرا تعلق چونکہ شاکرہ باجی سے بھی ہے اس لئے لکھنا پڑا۔

ہماری شاکرہ باجی 1920 میں سیتھ میں پیدا ہوئیں اور 1922ء میں اپنے والدین کے ہمراہ ترکِ وطن کر کے لکھنؤ آ گئیں جہاں محلہ بشیرت گنج میں ماموں جان نے اپنا گھر بنا لیا تھا۔ شاکرہ باجی کی تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ وہ اپنے والدین کی اولادوں میں سب سے چھوٹی تھیں۔

1932ء میں جب کہ میں دو سال کا تھا مختلف مقامات پر رہنے کے بعد ابا جان بھی لکھنؤ آ کر ماموں جان کے پڑوس میں آباد ہو گئے۔ مجھے اپنے بچپن کا زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب ہمارے دونوں خاندانوں میں اس طرح قریبی تعلقات تھے کہ ہمارے درمیان کسی دوئی کا شائبہ بھی نہ تھا۔ ہمارا آنا جانا اُٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا ایک دوسرے کے بغیر ادھورا تھا۔ ہم لوگوں کو ماموں جان کے گھرانے کے بغیر چین نہیں تھا اور یہی حال ان کا بھی تھا۔ اور لاریب کہ ان تعلقات میں خاندانی اثرات اور روابط سے زیادہ احمدیت کی برکت کا اثر تھا جس نے دونوں خاندانوں کو اس طرح شیر و شکر کر رکھا تھا کہ لوگ مثالیں دیا کرتے تھے۔

ماموں جان کے گھرانے سے تو پھر بھی ہمارا خون کا رشتہ تھا مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس زمانے میں جو ہمارے سگے رشتہ دار تھے وہ اختلافِ عقیدہ کی وجہ سے قطعاً غیر اور اجنبی بن چکے تھے۔ اس کمی اور تشنگی کو اللہ انہیں بہت بہت نوازے اور جزائے خیر دے۔ احمدی احباب نے اس طرح پورا کر دیا کہ ہمیں بالکل احساس نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی غیر ہیں۔ ان میں سے کوئی ماموں تھا تو کوئی چچا، کوئی خالو تھا تو کوئی پھوپھا۔ حتیٰ کہ نانا اور دادا بھی تھے اور یہی حال خواتین میں بھی تھا۔ نانی، دادی خالہ پھوپھی سب ہی تو تھیں اور یہ صرف زبانی رشتے نہیں تھے بلکہ ان رشتوں کو باقاعدہ نبھایا جاتا تھا اور ان کا اکرام کیا جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے لکھنؤ میں دو نہایت معزز اور ذی علم بھائی تھے سید ارشد علی صاحب اور سید ارتضٰی علی صاحب۔ سماجی لحاظ سے چاہے جو بھی ہوا ان کا رتبہ رہا ہو لیکن ہمارے لئے وہ صرف بڑے ماموں اور چھوٹے ماموں تھے۔ اور اسی استحقاق سے ہم ان کے گھروں میں جاتے بھی تھے۔ ہم مزے بھی اڑاتے اور ہنگامے بھی کرتے مگر بھانجے ہونے کے ناطے ساری گڑبڑ نظر انداز کر دی جاتی تھی۔ یہاں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے جو اگرچہ ہے تو غیر متعلق مگر میں سنائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

علم و فضل کے علاوہ بڑے ماموں سید ارشد علی صاحب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بے حد جہیر الصوت یعنی غیر معمولی بلند آواز کے مالک تھے۔ ان کی آواز بلند ہی نہیں بلکہ بے حد منفرد دھماکہ خیز اور خشونت سے بھری ہوئی تھی۔ اگر کسی کی خیریت بھی پوچھ رہے ہوں تو لگتا تھا کہ بیحد غصے سے ڈانٹ رہے ہیں۔ یہ آواز تقریروں میں اور مناظروں میں ان کے بہت کام آتی تھی جس کے بل پر وہ سب پر چھا جایا کرتے تھے اور پورا مجمع ان سے متاثر ہو جایا کرتا تھا۔ تو قصہ یوں ہے کہ جب 1947ء میں تقسیم ہند ہوئی تو چھوٹے ماموں سید ارتضٰی علی صاحب لکھنؤ سے کراچی چلے آئے لیکن بڑے ماموں سید ارشد علی صاحب لکھنؤ ہی میں رہے۔ میں نے بھی ابا جان کی وفات کے بعد حیدر آباد دکن کی راہ لی جہاں سے 1950ء میں کراچی چلا آیا۔ کراچی میں میری چھوٹے ماموں سید ارتضٰی علی صاحب اور ان کے بیٹوں، بھائی جان سید ناصر احمد صاحب اور بھائی جان سید اقبال احمد صاحب عرف بالے بھائی سے ملاقات ہوتی رہی۔ پھر انہوں نے کراچی چھوڑ دیا تو بات ختم ہو گئی۔ ہوتے ہوتے 1974ء آ گیا۔ ایک دن کسی سے معلوم ہوا کہ قبلہ سید ارشد علی صاحب لکھنؤ سے تشریف لے آئے ہیں اور اپنے بڑے بیٹے سید ظفر احمد صاحب کے پاس مقیم ہیں۔ اُس زمانے میں کسی احمدی سے ملاقات کی سب سے اچھی جگہ صدر کا احمدیہ ہال ہوا کرتا تھا۔ جہاں جمعہ کی نماز پڑھنے سب ہی آیا کرتے تھے۔ بہر حال جب میں جمعہ کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو ہال کی دائیں گیلری سے ارشد ماموں کی منفرد آواز سنائی دی۔ میں سیدھا اسی طرف بڑھ گیا۔ ان کی نظر مجھ پر پڑی تو چہرہ اک دم چمک اُٹھا۔ بے تابانہ آگے بڑھے، گلے لگایا اور بڑی شفقت سے میری اور دوسرے عزیزوں کی خیریت پوچھنے لگے۔ اب میری نالائقی ملاحظہ فرمائیے کہ میں ان گزرے ہوئے طویل اٹھائیس برسوں میں یہ بالکل بھول چکا تھا کہ میں انہیں لکھنؤ میں کیا کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔ لہٰذا جب میں نے انہیں انکل کہا تو وہ چونکے۔ دوسری دفعہ کہا تو پھر بھی انہوں نے برداشت کیا۔ مگر تیسری مرتبہ جب میں نے انکل کہا تو وہ پھٹ پڑے۔ ”یہ کیا انکل انکل کی رٹ لگا رکھی ہے۔ ارے، میں تیرا ماموں ہوں۔ بڑا ماموں۔“ یہ کہہ کر جو گرجے برسے ہیں تو میں دم بخود رہ گیا۔ اور ایک اکیلا میں کیا پورا احمدیہ ہال کا مجمع ہی حیران و ششدر تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ خیر بڑی مشکل سے معافی تلافی کر کے جان چھڑائی اور انہیں راضی کیا اور انہوں نے دوبارہ گلے لگا کر مجھے معاف کر دیا۔ اب بھی کبھی کبھی رات کی تنہائی میں ان کی یہ پیار بھری ڈانٹ یاد آتی ہے تو روح جھوم جاتی ہے اور بے ساختہ بڑے ماموں کے لئے دل سے مغفرت

اور رحمت کی دعائیں نکلتی ہیں۔

یہ جملہ معترضہ کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا۔مگر کیا کروں بقول شاعر ؎ لذیز بود حکایت دراز تر گفتم

بہر حال میں نفسِ مضمون کی طرف لوٹتا ہوں۔میں اپنے اور ماموں جان ڈاکٹر لعل محمد صاحب مرحوم کے خاندانوں کے ارتباط کا ذکر کر رہا تھا۔تو یہ ارتباط اس وقت ٹوٹا جب نصرت باجی مرحومہ کی جواں سال موت کے صدمے سے نڈھال ہو کر ماموں جان لکھنؤ چھوڑ کر قادیان دارالامان چلے گئے اور وہیں دیارِ حبیب میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔لیکن رہائش کی اس تبدیلی سے ہماری باہمی محبتوں میں کوئی فرق نہیں پڑا اور خط و کتابت سے تعلقات برابر قائم رہے۔اور جہاں تک ملاقات کا تعلق ہے تو اس کی حسرت ہر سال جلسہ سالانہ کے موقع پر مٹائی جاتی تھی۔یہی صورتِ حال قیامِ پاکستان کے بعد بھی قائم رہی۔میں پاکستان آ کر کراچی آباد ہو گیا تھا جبکہ ماموں جان قبلہ کا قیام بہاولپور لاہور اور ربوہ میں رہا۔لہٰذا خط و کتابت کے علاوہ جلسہ سلالانہ کے موقع پر ربوہ میں ملاقات کا دستور یہاں بھی قائم رہا۔

قادیان شریف میں ہماری شاکرہ باجی کا قیام 1938ء سے 1947ء تک رہا۔قادیان شریف میں قیام کے دوران ہی ان کی شادی جون 1942ء میں بھائی جان شیخ لطیف الرحمٰن صاحب سے ہوئی جس میں بطور خاص ہم بھی شریک ہوئے تھے۔یہ رشتہ بلا شبہ قران السعدین تھا کیوں کہ بھائی جان شیخ لطیف الرحمٰن صاحب کا تعلق جہانِ احمدیت کے ایک بے حد جلیل القدر خاندان سے تھا۔بھائی جان کے دادا جان حضرت منشی حبیب الرحمٰن سکنہ حاجی پور کپور تھلہ کا شمار حضرت اقدس مسیح موعود کے قدیم ترین عشاق میں ہوتا ہے۔ان کے بیٹے حضرت منشی کظیم الرحمٰن بھی حضور کے رفیقوں میں شامل تھے۔جن کے صاحبزادے بھائی جان شیخ لطیف الرحمٰن تھے۔گویا یہ خاندان ایں خانہ ہمہ آفتاب است کا مصداق تھا۔قیام پاکستان کے بعد شاکرہ باجی اور لطیف الرحمٰن بھائی جان لاہور کے محلّہ دھرمپورہ میں آباد ہوئے۔یہیں ان کے اکلوتے بیٹے عزیزم ڈاکٹر سلیم الرحمٰن پیدا ہوئے۔بھائی جان شیخ لطیف الرحمٰن کی ریٹائرمنٹ کے بعد یہ خاندان ربوہ منتقل ہو گیا۔جہاں کافی عرصے تک محلّہ دارالصدر میں یہ خاندان صدر انجمن احمدیہ کے کوارٹروں میں مقیم رہا اور بھائی جان صدر انجمن میں کام کرتے رہے۔آخر عمر میں بھائی جان نے ربوہ کے محلّہ دارالنصر میں اپنا ذاتی مکان تعمیر کرا لیا اور وہاں قیام پذیر ہو گئے۔

ہمارے ماموں جان قبلہ ڈاکٹر لعل محمد صاحب کو اپنے بچوں کی تعلیم سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ اس سلسلے میں لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کسی تفریق کے قائل نہیں تھے۔انہوں نے شاکرہ باجی کو بھی لکھنؤ کے مسلمانوں کے سب سے بہتر اور مشہور ادارے کرامت مسلم گرلز ہائی سکول میں جو بعد ازآں ڈگری کالج ہو گیا تعلیم دلائی تھی۔شاکرہ باجی کا تعلیمی ریکارڈ بہت شاندار اور تابناک تھا۔اسی اسکول سے انہوں نے میٹرک کیا اور پورے ڈویژن میں اول آئیں۔ماموں جان کے قادیان شریف منتقل ہو جانے اور بعد ازآں شادی کے بندھن میں بندھ جانے کی وجہ سے ان کا تعلیمی سلسلہ جاری نہ سکا۔مگر انہوں نے اپنی ذاتی کاوش سے اور مسلسل مطالعے سے اپنی تعلیمی استعداد اس قدر بڑھا لی کہ بی۔اے اور ایم اے بھی ان پر رشک کرتے تھے۔ساتھ ہی دینی تعلیم پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔قرآنِ کریم، احادیث، کتب حضرت مسیح موعود اور سلسلہ کے دیگر لٹریچر کا بھی مطالعہ جاری رہتا تھا۔درثمین کا اکثر حصہ انہیں زبانی یاد تھا جس کی وجہ ان کا ذوقِ شاعری تھا۔ہمارے ماموں جان ڈاکٹر لعل محمد مرحوم خود بھی بڑے قادرالکلام شاعر تھے اور یہی ذوق ورثہ میں باجی مرحومہ کو بھی ملا تھا۔ان کا ذوقِ شاعری اسکول کے زمانے میں ہی پروان چڑھا۔رفتہ رفتہ وہ بھی اعلیٰ پائے کی شاعرہ بن گئیں۔مگر جلد ہی انہوں نے اپنے شاعرانہ جذبات کا رخ جماعتی خدمات کی طرف موڑ دیا۔دیگر رسائل کے علاوہ ان کا کلام اکثر جماعتی پرچوں روزنامہ الفضل اور ماہنامہ مصباح میں شائع ہوتا تھا اور شاعرانہ مزاج کے لوگوں سے داد پاتا تھا۔

شاکرہ باجی مرحومہ کو صرف اپنی ہی تعلیم کا شوق نہیں تھا بلکہ وہ چاہتی تھیں کہ دوسروں میں بھی یہ ذوق زیادہ سے زیادہ پیدا ہو۔ان کا کہنا تھا اور بالکل ٹھیک کہنا تھا کہ صحیح تعلیم کے بغیر نہ تو انسان دنیا کو صحیح رنگ میں سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی دین کو۔انہوں نے صرف اپنے صاحبزادے ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کو بھی لاہور، اسلام آباد اور کینیڈا کے بہترین تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں اپنا پیٹ کاٹ کر اعلیٰ تعلیم نہیں دلائی بلکہ لاہور اور ربوہ میں بھی ان کی توجہ اور کاوش سے سیکڑوں بچیاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئیں خاندان کا جو کوئی بچہ تعلیمی صلاحیت کا اظہار کرتا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیاب ہوتا تو وہ بہت خوش ہوتی تھیں اور دعاؤں اور محبت سے ہمت افزائی کر کے اس کا دل بڑھاتی تھیں۔میرے بیٹے عزیزم مسرور احمد سلمہٗ اس ضمن میں ان کی دعاؤں سے بہت مستفیض ہوئے۔میری بڑی ہمشیرہ محترمہ احمدی بیگم صاحبہ بیان کرتی ہیں کہ ان کے تعلیم حاصل کرنے میں بھی شاکرہ باجی کی سعی و کاوش اور ہمت کا بہت دخل ہے۔ان کا کہنا ہے کہ لکھنؤ میں چونکہ کرامت مسلم گرلز اسکول ہمارے گھر سے بہت دور تھا اس لئے والد مرحوم کو وہاں داخلہ دلانے میں تأمل تھا۔شاکرہ باجی مرحومہ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اپنی پھوپھی یعنی میری والدہ کے پاس گئیں اور ان پر زور دیا کہ احمدی کو اسکول میں ضرور داخلہ دلایا جائے اور ساتھ ہی روزانہ اپنے ہمراہ اسکول لے جانے اور واپس لانے کی پیش کش بھی کر دی جس سے والدہ بہت متاثر ہوئیں اور ان کی کوشش اور زور دینے سے ابا جان بھی راضی ہو گئے۔اور یوں یہ مسئلہ طے پا گیا۔احمدی باجی کا یہ بھی کہنا ہے کہ شاکرہ باجی مجھے پابندی سے اسکول ہی نہیں لے جاتی بلکہ میری تعلیمی سرگرمیوں پر بھی گہری نظر رکھتی تھیں اور امتحانوں کے دنوں میں میری مدد بھی کرتی تھیں اور ضروری نکات یاد بھی کرواتی تھیں۔

تعلیمی ذمہ داریوں کے علاوہ شاکرہ باجی کو دینی فرائض کی بروقت ادائیگی سے بھی کمال شغف تھا۔ نمازوں کی بے حد پابند تھیں اور ہمیشہ اول وقت میں یہ فریضہ ادا کرنے کی کوشش کرتی تھیں اور اس سلسلے میں کسی کوتاہی یا رعایت کی روادار نہیں تھیں۔ احمدی باجی ہی بتاتی تھیں کہ بچپن میں ایک مرتبہ ہم دونوں کھیل رہے تھے اور کھیل میں بہت مزہ آرہا تھا کہ اچانک کان میں اذان کی آواز آئی۔ شاکرہ باجی فوراً رک گئیں اور کہا کہ چلو نماز پڑھ لیں۔ میں نے کہا نہیں ابھی تو کھیل باقی ہے۔ نماز تھوڑی دیر بعد پڑھ لیں گے۔ مگر شاکرہ باجی کسی صورت نہیں مانیں اور ہمیں کھیل ادھورا چھوڑ کر جانا پڑا۔ نماز روزے کی یہ پابندی شاکرہ باجی کا زندگی بھر کا معمول رہا۔ دینی فرائض کی ادائیگی سے شغف کے باوجود جسمانی کھیلوں سے انہیں خاص دلچسپی تھی اور وہ انہیں جسمانی صحت کے لئے ضروری سمجھتی تھیں۔ احمدی باجی بتاتی تھیں کہ شاکرہ باجی ہر وقت پڑھائی کے پیچھے ہی نہیں پڑی رہتی تھیں انہیں کھیلوں سے بھی بہت دلچسپی تھی اور بہت سے نئے کھیل انہوں نے مجھے سکھائے تھے۔

جماعت اور جماعتی کاموں سے بھی شاکرہ باجی کو بہت محبت اور رغبت تھی۔ امام وقت کی اطاعت اور محبت ان کا ایمان تھا۔ ہر جماعتی تحریک پر بڑے خلوص سے کھلے دل کے ساتھ حصہ لیا کرتی تھیں۔ شاکرہ باجی کی جماعتی خدمات پر لاہور کی احمدی بیگم زہرہ صاحبہ نے بڑی کاوش اور محنت سے ایک گوشوارہ ترتیب دیا ہے (محترمہ احمدی بیگم زہرہ خود بھی مغتنم روزگار ہمہ جہت شخصیت ہیں جو کراچی ربوہ اور لاہور میں مختلف جماعتی عہدوں پر کام کر کے اپنی شخصیت کا لوہا منوا چکی ہیں وہ صرف ایک اعلیٰ کارگزار ہی نہیں ہیں بلکہ دوسروں میں بھی جماعتی خدمات کی روح بیدار کرنے میں ممتاز ہیں۔ عرصہ سے خیال تھا کہ ان کی بلند پایہ شخصیت پر کچھ لکھوں مگر میری بیوی محترمہ خیر النساء منصور اس کار خیر میں بازی لے گئیں۔ محترمہ احمدی بیگم زہرہ پر ان کا لکھا ہوا مقالہ عنقریب زیب قرطاس ہوگا) محترمہ احمدی بیگم زہرہ صاحبہ کا ترتیب دیا ہوا گوشوارہ میں ان کے شکریہ کے ساتھ اپنے مضمون میں شامل کر رہا ہوں۔ مگر یہ گوشوارہ تشنہ ہے کیونکہ یہ صرف ان کے قیام لاہور کے زمانہ کا احاطہ کرتا ہے۔ قیام ربوہ کے زمانہ کا گوشوارہ سعی بسیار کے باوجود مجھے نہیں مل سکا۔ بہرحال مل گیا تو کسی آئندہ مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ ان کی کاوش کی تصویر مکمل ہو جائے۔ بہرحال محترمہ احمدی بیگم زہرہ صاحبہ کی تحریر کی تلخیص ذیل میں پیش ہے۔

1- محترمہ شاکرہ خاتون 1961-1962 میں ناصرات الاحمدیہ لاہور کی نائب نگران منتخب ہوئیں لیکن نگران صاحبہ کے جلد ہی ترک وطن کر دینے کی وجہ سے انہیں نگران کا عہدہ تفویض کر دیا گیا۔ یہ ذمہ داری انہوں نے دس سال تک بڑی خوش اسلوبی اور نیک نامی سے نبھائی۔ ان کی ذاتی توجہ نگرانی اور محنت کے نتیجے میں لاہور کی ناصرات کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ ان کے زمانہ نگرانی میں لاہور کی ناصرات کی نہ صرف مقامی طور پر قدر دانی کی جاتی رہی بلکہ مرکزی اجتماعات میں بھی لاہور کی ناصرات کو امتیازی مقام حاصل رہا۔

2- محترمہ شاکرہ خاتون کی نگرانی کے زمانے میں لاہور کی ناصرات نے ایک مرتبہ شیلڈ حاصل کی اس کے علاوہ تقریباً ستر (70) فی صد ناصرات نے سترہ آیات کے حفظ کی سندیں بھی حاصل کیں۔

3- محترمہ شاکرہ خاتون کو نہ صرف مقامی طور پر بلکہ مرکز میں بھی تقریری مقابلہ جات کا جج بنایا جاتا رہا اور ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی رہی۔ علاوہ ازیں اپنے اعلیٰ شعری اور ادبی ذوق کی بنا پر انہوں نے خود بھی کئی مرکزی مقابلوں میں شریک ہو کر اول اور دوم انعامات حاصل کئے۔

4- محترمہ شاکرہ صاحبہ نے جشن پچاس سالہ میں شرکت کر کے 126 اشعار پر مشتمل ایک طویل اور مبسوط نظم لکھ کر پہلا انعام حاصل کیا۔ اس نظم میں حضرت اقدس مصلح موعود نور اللہ مرقدہٗ کے احسانات اور لجنہ اماء اللہ کی تاریخ اور کارناموں کا بڑی خوش اسلوبی اور تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس نظم کو بہت پسند کیا گیا۔ یہ تاریخی نظم مصباح کے دسمبر 1972 کے شمارے میں چھپی ہے۔

5- 1963ء میں مرکز کی تحریک پر محترمہ شاکرہ خاتون نے دس اشعار پر مشتمل ترانہ لکھ کر پہلی پوزیشن حاصل کی۔ یہ ترانہ تاریخ لجنہ جلد سوم میں شائع ہوا تھا۔ (یہ ترانہ شاکرہ باجی مرحومہ کی وہ واحد نظم ہے جو انہوں نے خود لکھ کر مجھے بھجوائی تھی۔ یہ نظم ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے اور ان کے کلام کے نمونے کے طور پر اس مضمون کے آخر میں پیش کی جارہی ہے۔)

6- 1965ء میں لجنہ اماء اللہ لاہور کے شعبہ تعلیم کے زیر انتظام بچیوں کی تعلیم کے لئے دار الذکر لاہور میں ایک گرلز اسکول کھولا گیا۔ اس اسکول میں محترمہ شاکرہ خاتون نے بھی کچھ عرصہ تک فرائض تدریس انجام دے کر اس اسکول کے معیارِ تعلیم کو بلند کیا۔

7- 1966ء میں جب حضرت خلیفۃ المسیح الثالثؒ لاہور تشریف لائے تو لجنہ اماء اللہ لاہور کی جانب سے پیش کردہ ایڈریس پڑھنے کی سعادت محترمہ شاکرہ خاتون کو حاصل ہوئی۔ جن کے تلفظ کی ادائیگی اور پڑھنے کے انداز کی حضور اقدسؒ نے بہت تعریف کی۔

8- 1967ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد محترمہ شاکرہ خاتون کے شوہر ربوہ منتقل ہو گئے اور اسی طرح محترمہ شاکرہ خاتون کا لاہور سے وہ تعلق ٹوٹ گیا جو 1947ء سے مستقل قائم چلا آرہا تھا۔

محترمہ شاکرہ باجی اخلاق حسنہ کا مجسمہ تھیں۔ ہر ایک سے بے حد اخلاق سے ملتی تھیں اور اس کے دکھ درد میں شریک ہوتی تھیں۔ کوئی اجنبی بھی اگر ایک بار ان سے مل لیتا تو وہ سمجھتا تھا کہ ان سے بڑھ کر کوئی میرا ہمدرد نہیں ہے۔ خاندانِ حضرت مسیح موعود سے انہیں بہت عقیدت اور محبت تھی اور وہ اکثر خواتین مبارکہ کی زیارت کرنے اور برکات سمیٹنے کے لئے ان کی خدمت میں جایا کرتی تھیں۔ باجی مرحومہ بے حد مہمان نواز طبیعت کی مالک تھیں اور پیشانی

پر بل ڈالے بغیر مہمانوں کی خدمت میں مصروف رہا کرتی تھیں۔ اس لئے اپنے سسرالی عزیزوں میں بہت مقبول تھیں۔ جلسہ سالانہ کے زمانے میں ربوہ میں ان کا گھر دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ انجمن کا دو کمروں کا چھوٹا سا کوارٹر مگر اس کا ہر گوشہ اور ہر کونا مہمانوں اور ان کے سازوسامان سے گویا اُبلا پڑتا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے سارے ربوہ کے مہمان یہیں جمع ہو گئے ہیں۔ اور ان مہمانوں میں ہر عمر ہر سائز ہر وضع اور ہر طبیعت کے مہمان ہوتے تھے جن کی ضرورتیں اور ترجیحات بھی جدا جدا ہوتی تھیں اور ہماری باجی صاحبہ ہیں کہ طبیعت کی خرابی اور جسمانی کمزوری کے باوجود شدید سردی میں ہنستی مسکراتی ہر ایک کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہر وقت تازہ دم اور تیار نظر آ رہی ہیں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب جلسے کے زمانے میں ملنے کے لئے ان کے گھر جاتا تھا تو مہمانوں کے ہجوم میں انہیں باقاعدہ ڈھونڈنا پڑتا تھا اور وہ عام طور پر اپنے چھوٹے سے کچن میں اپنے کسی نہ کسی بیمار مہمان کے لئے پرہیزی کھانا بنانے میں مصروف ملتی تھیں۔

عام زندگی میں باجی جان بہت خاموش طبع نظر آتی تھیں۔ عام خواتین میں جو ایک بڑھ چڑھ کر باتیں بنانے کا انداز ہوتا ہے وہ ان میں بالکل نہیں تھا۔ مگر ان کی طبیعت میں لطیف مزاح کا ایک نایاب جوہر پوشیدہ تھا۔ وہ خاموشی سے بیٹھی باتیں سنتی رہتی تھیں پھر چپکے سے ایک ایسا جملہ بول دیتی تھیں کہ ہنسی سے محفل کشتِ زعفران بن جاتی تھی اور طبیعتوں کی ساری گرد ڈھل جاتی تھی۔ ان کی باتوں میں علمی چاشنی ہوتی تھی اور ان کی باتیں سن کر ایسا لگتا تھا کہ ہم نے کچھ حاصل کر لیا ہے۔ زبان کی صحت اور الفاظ کے تلفظ کا خصوصی خیال رکھتی تھیں۔ ان کی نظم و نثر کی زبان بے داغ اور کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی ہوتی تھی۔ جسے سن کر بہت کچھ سیکھا جا سکتا تھا۔

ویسے شاکرہ باجی خشک مردم بیزار نہیں بلکہ بہت ملنسار طبیعت کی مالک تھیں۔ رشتہ داروں سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ اپنے بہن بھائیوں سے صرف محبت ہی نہیں کرتی تھیں بلکہ ان پر جان چھڑکتی تھیں مجھے شاکرہ باجی کی بڑی بہن محترمہ منظور باجی مرحومہ کی آخری علالت یاد ہے۔ ان کی بیماری خاصا طول پکڑ گئی تھی مگر شاکرہ باجی نے ایک لمبے عرصے تک ان کی جس خندہ پیشانی سے خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کچھ ایسا ہی سلوک ان کا دوسری بڑی بہن محبوب باجی سے بھی تھا۔ انہیں اپنے واجب الاحترام بھائی محترم شیخ محمود الحسن صاحب صاحب سی ایس پی ممبر بورڈ آف ریونیو مشرقی پاکستان سے بھی بہت محبت تھی اور وہ بھی انہیں بہت چاہتے تھے۔ باجی کے اپنی بھاوج محترمہ زینب حسن صاحبہ بنت سیٹھ عبداللہ دین مرحوم سے بھی بہت خوشگوار تعلقات تھے۔ اپنے بھانجوں عزیزان رفیق محمد خان طاہر اور لئیق محمد خان ناصر پر تو وہ جان چھڑکتی تھیں اور انہیں بھی اپنی خالہ جان سے بہت محبت تھی۔ خود مجھ سے میری بیوی، میرے بچوں اور میری ہمشیرگان سے ہمیشہ بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتی تھیں۔ ان کی محبت کبھی بھلائی نہیں جا سکتی۔

شاکرہ باجی مرحومہ کو عبادات سے خاص شغف تھا۔ دن کی نمازوں کے علاوہ تہجد بھی اہتمام سے ادا کرتی تھیں۔ درود شریف کا ورد کثرت سے کرتی تھیں۔ سچے خواب اکثر دیکھتی تھیں۔ میری بڑی ہمشیرہ احمدی بیگم صاحبہ بتایا کرتی تھیں کہ ایک مرتبہ شاکرہ باجی نے نبی کریم ﷺ اور حضرت مسیح موعود کو خواب میں دیکھا کہ ایک کئی منزلہ بلند و بالا خوبصورت عمارت ہے جس میں باجی کو ان کے والد ڈاکٹر لعل محمد صاحب مرحوم لے کر جاتے ہیں سب سے اوپر کی منزل میں ایک تخت پر دو پاکیزہ وجیہہ صورت بزرگ شخصیات تشریف فرما ہیں۔ ان میں ایک کی پگڑی سفید اور دوسرے کی سبز ہے۔ ماموں جان ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان سے ملو۔ یہ آنحضرت ﷺ اور حضرت مہدی علیہ السلام ہیں۔ باجی جان نے چونکہ حضرت مسیح موعود کی تصویر دیکھ رکھی تھی اس لئے سفید پگڑی والے بزرگ کو فوراً پہچان لیا۔ جب باجی جان کی آنکھ کھلی تو بہت خوش ہوئیں اور سب کو بڑی مسرت سے اپنا خواب سنایا۔

محترمہ شاکرہ باجی خاصے لمبے عرصہ سے بلڈ شوگر کے مرض میں مبتلا تھیں۔ مگر بڑی ہمت سے بیماری کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے فرائض منصبی میں مصروف رہتی تھیں۔ مگر 1993 میں بھائی جان شیخ لطیف الرحمن کی وفات کے صدمے کے نتیجے میں مرض طبیعت پر غالب آ گیا اور ان کی صحت اک دم خراب ہو گئی۔ ان کے صاحبزادے عزیزم ڈاکٹر سلیم الرحمن صاحب انہیں اپنے ہمراہ کینیڈا لے گئے۔ بہت علاج معالجہ ہوا۔ ایک آپریشن بھی ہوا مگر وقت پورا ہو چکا تھا۔ آخر 7 اگست 1995ء کو وہ ہم سب کو گریاں چھوڑ کر اپنے مولا کے حضور حاضر ہو گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ پاک ان کی مغفرت فرمائے اور تربت کو عنبریں کرے۔ درجات بلند فرمائے اور اپنے قرب کے دروازے ان پر کھول دے آمین۔

1995ء کا سال مجھے ہمیشہ یاد رہے گا کیونکہ اس سال مجھے دوہرے صدمے اٹھانے پڑے۔ کیونکہ شاکرہ باجی مرحومہ کے انتقال کے بعد میری چھوٹی ہمشیرہ عزیزہ حمیدہ بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی۔ اللہ پاک اس کی بھی مغفرت فرمائے۔ اس کے لئے بھی اپنے قرب کے دروازے کھولے۔ آمین

کینیڈا جا کر اگرچہ شاکرہ باجی ہم سب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں مگر اس میں ایک خوشی کا پہلو بھی مضمر ہے کہ اس طرح انہیں اپنے پوتے عزیزم عدیل الرحمن کو دیکھ لینے اور اپنی گود میں کھلانے اور اپنی دعاؤں کی برکتوں سے مستفیض کرنے کا موقع مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مرحومہ کو یہ سعادت بھی نصیب کی کہ حضرت خلیفۃ المسیح الرابع رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعزیت فرماتے ہوئے عزیزم ڈاکٹر سلیم الرحمن صاحب کو لکھا کہ خدا تعالیٰ آپ کو مرحومہ کی نیکیاں قائم رکھنے کی توفیق دے۔ حضور اقدس کا یہ فرمان مرحومہ کی اولاد اور ان کی آئندہ نسلوں کے لئے باعث فخر ہے اور ان کی گراں قدر ذمہ داری بھی ہے۔ شاکرہ باجی مرحومہ نے 1944ء میں وصیت کر دی تھی اور وہ ابتدائی پانچ ہزار موصیوں کی فہرست میں شامل تھیں۔ مگر ان کے بیٹے کی خواہش

اور درخواست پر ان کی کینیڈا کے قبرستان موصیاں کیلگری میں تدفین کی گئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی لحد کو پرنور کرے آمین

مضمون ختم کرتے ہوئے میں یہ ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ شاکرہ باجی مرحومہ خوش نصیب تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان سے انہوں نے ایک اچھی اور کامیاب زندگی گزاری۔ سلسلہ احمدیہ کی خدمات میں حسب مقدور بھرپور حصہ لیا اور سلسلہ احمدیہ عالم گیر کے دو والا شان اماموں کے مبارک ہاتھوں سے اپنی خدمات کے اعتراف میں قلم حاصل کئے۔ پہلا قلم انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الثالث رحمہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور ان کی منظومات اور تحریروں کی تعریف فرمائی تھی جب کہ دوسرا قلم انہیں حضرت خلیفۃ المسیح الرابعؒ کے دستِ مبارک سے عطا ہوا اور حضور انورؒ نے ان کی منظومات کی تعریف فرماتے ہوئے ربوہ میں لجنہ کے جلسہ عام میں انہیں ''ناصرۃ القلم'' کے خطاب سے نوازا۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے کہ جس پر محترمہ شاکرہ باجی مرحومہ کی نسلیں جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

اب میں ذیل میں شاکرہ باجی مرحومہ کا لکھا ہوا ناصرات الاحمدیہ کا وہ ترانہ پیش کرتا ہوں جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ یہ ترانہ اگرچہ ایک مختصر سی نظم ہے مگر اس میں وہ تمام محاسن اور خوبیاں پائی جاتی ہیں جو شاکرہ باجی مرحومہ کے کلام کی خصوصیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی اولاد کو جلد از جلد ان کا کلام کتابی صورت میں شائع کرنے کی توفیق دے تا کہ یہ ادبی لعل و جواہر محفوظ ہو جائیں۔

ترانہ ناصرات الاحمدیہ

ناصرات الاحمدیہ کیا مبارک نام ہے
دین ملک اور قوم کی خدمت ہمارا کام ہے
راستی پر ہم ہیں قائم جھوٹ سے بیزار ہیں
ہر گھڑی تبلیغِ دیں کے واسطے تیار ہیں
ہے خدا اک اور محمد اس کے بندے اور رسول
مہدیٔ آخر زماں کو کر لیا ہم نے قبول
راہ جو سیدھی دکھاتا ہے فقط اسلام ہے
احمدیت اصل میں ..... کا پیغام ہے
ہم کسی فیشن پرستی سے نہیں مرعوب ہیں
جو اصولِ دین ہیں ہم کو وہی مرغوب ہیں
ہیں فدائے احمدیت ذوق سے اور شوق سے
اپنی بہنوں کو بچائیں گے بدی کے طوق سے
ہیں تو ہم کم سن مگر ہمت ہماری ہے بلند
شرک و بدعت کے محل پر بڑھ کے ڈالیں گے کمند
ہم ہوں مغرب یا کہ مشرق شہر یا دیہات میں
دین ہے پیشِ نظر یکساں ہیں سب اس بات میں
کام سے اپنے نہ ہم غافل ہوں اے ربِّ رحیم
رہنمائی کر ہماری ہادی و مولا کریم
ہم کو ملتی جائے نصرت تیری یا رب دم بدم
کامیابی کی طرف بڑھتے رہیں اپنے قدم